آخری قسط

پاکستان میں اسلامی قانون کا مستقبل

ملک محمد جعفر ایڈووکیٹ

اس مضمون کی پہلی پانچ قسطوں میں سب سے پہلے تو یہ بتایا گیا کہ عدلیہ سے یہ توقع رکھنا کہ وہ فقہ کے مستند ماٰخذ کی آزادانہ تعبیر کر کے پاکستان میں مروجہ اسلامی قانون میں کوئی بنیادی تبدیلی لاسکتی ہے صحیح نہیں۔ اس کے بعد یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ کام عوام کے نمائندوں پر مشتمل اسمبلی کا ہے کہ وہ اسلامی قانون کی تشکیل کی ذمہ داری لے۔ اس ضمن میں ایک بڑی رکاوٹ جو اس مقصد میں حائل ہے، وہ مختلف فرقوں کے فقہی احکام کے آپس کے اختلافات ہیں۔ ان اختلافات کی بعض مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ اور ان کا ہمارے معاشرے پر جو ناخوشگوار اثر پڑ رہا ہے، اُسے تفصیل سے بتایا ہے۔ اسی سلسلے میں یہ سوال اُٹھایا گیا ہے کہ آیا مسلمان فرقوں کے ان اختلافات کے بارے میں باہمی مفاہمت کی کوئی صورت ممکن ہے اور کیا یہ پالیسی قابلِ عمل ہے کہ ہم شخصی قانون پر مشتمل ایک ایسا ضابطہ مرتب کریں جس کے قواعد تمام مسلمانوں پر حاوی ہوں، قطعِ نظر اس سے کہ فریقینِ مقدمہ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں؟ ——— مضمون نگار کے نزدیک یہ نہ صرف ممکن ہے، بلکہ اس کی ضرورت بھی ہے، اور اس کی تائید میں دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ (مدیر)

پاکستان میں اسلامی قانون کی تشکیل سے دلچسپی رکھنے والوں کو عباسی خلافت کے دوران معتزلہ کی انتہاپسندی کے خلاف جمہور کا جو شدید ردِّ عمل ہُوا۔ اور جس کی وجہ سے معتزلہ کی تحریک دبا دی گئی، اُسے سامنے رکھنا چاہیئے۔ ایک انتہاپسندی دوسری انتہاپسندی کو جنم دیتی ہے۔ اور اس سے اصلاح وارتقاء کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اس لئے اسلامی قانون کی اصلاح اور تدوین کے پروگرام میں کامیابی کے لئے ازبس ضروری ہے کہ اعتدال پسندی کے مسلک کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے، انتہا پسندانہ انقلابی نوعیت کی تبدیلیوں سے حتی الوسع اجتناب کیا جائے اور پُرانی روایات اور ملّی شعائر کے ساتھ غیر ضروری تصادم کی صورت پیدا نہ ہونے دی جائے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر اقبال کی رائے بہت حد تک ہماری رہنمائی کر سکتی ہے۔ ارتقاء اور قدامت پسندی کے درمیان راہِ اعتدال کے حق میں

اُنھوں نے حسبِ ذیل خیالات کا اظہار فرمایا ہے :۔

" اہم اور غور طلب نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید زندگی کے بارے میں اصولی طور پر ایک ارتقائی نظریہ پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کتاب میں یہ اصولی مطمحِ نظر پیش کیا جائے، وہ کسی بھی شعبہ میں ارتقار کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ البتہ ہمیں یہ نہ فراموش کرنا چاہیئے کہ زندگی محض تغیر سے ہی عبارت نہیں بلکہ اس کی ذات میں حفظ و ثبات کے عناصر بھی موجود ہیں۔ اس حقیقت کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جہاں انسان اپنے تخلیقی عمل سے لطف اندوز ہوتے ہوئے زندگی کے نئے نئے جلووں کا متلاشی ہے، وہاں وہ اپنی انکشافِ ذات کے سامنے ایک طرح کی بے چینی بھی محسوس کرتا ہے۔ اپنی رُو بہ ارتقار حرکت کے دَوران وہ گاہ بگاہ اپنے ماضی پر نظر ڈالنے سے باز نہیں رہ سکتا کیونکہ اُسے اپنے وسعت پذیر عمل سے ایک طرح کا خوف محسوس ہوتا ہے۔ اپنے ارتقائی سفر میں روحِ انسانی متواتر ایسی قوتوں سے دو چار رہتی ہے، جو مخالف سمت کام کرتی ہیں اور ترقی کی رفتار میں ایک طرح کی روک پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں یُوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ زندگی اپنے ماضی کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہی آگے بڑھتی ہے۔ معاشرتی اصلاح کا کوئی لائحہ عمل متعین کرتے ہوئے ہمارے لئے لازم ہے کہ قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت کو بھی ملحوظ رکھیں۔ جدید تحریکِ عقلیت کو قرآنی تعلیمات کے ان اُصولوں کی روشنی میں ہی تمام موجودہ مسائل کا جائزہ لینا ہوگا۔ دنیا کی کوئی قوم مکمل طور پر اپنے ماضی کو رد نہیں کر سکتی۔ کیونکہ یہ قوم کا ماضی ہی ہے جس سے اُس کی موجودہ شخصیت متعین ہوتی ہے اور اسلامی معاشرے میں تو پُرانی روایات کی نظرِ ثانی کا مسئلہ اور بھی زیادہ نازک معاملہ ہے۔ اس لئے اس بارے میں مصلحینِ قوم کی ذمہ داریاں بھی اسی نسبت سے زیادہ سنگین نوعیت کی ہیں۔"

لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ علامہ اقبالؔ مستند فقہ کے حق میں صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ اُس کا جائزہ احترام کی نظر سے لیا جائے۔ علامہ اقبالؔ کا یہ نظریہ قطعاً نہیں ہے کہ ہم اس بات کے پابند ہیں کہ ہمیشہ کے لئے پُرانے فقہی قواعد کی اندھا دھند پیروی کرتے رہیں۔ اس بارے میں علامہ کی رائے بالکل واضح ہے۔ اُن کے نزدیک ہر دَور کے مسلمان اس امر میں آزاد ہیں کہ سابقہ تجربات کی روشنی میں اور اپنے موجودہ حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے فقہ اسلامی کی کوئی جدید تعبیر کریں۔ اس موضوع پر علامہ مرحوم کے خیالات یہ ہیں :۔

"جب ہم قرآن میں بیان کئے ہوئے اُصولوں پر غور کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نہ صرف انسانی فکر اور قانون سازی کے عمل میں ان اُصولوں سے کوئی روک پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اُن کی وسعت انسانی ذہن کے آزادانہ عمل کے لئے ایک طرح کا محرک ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ انہی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے فقہائے متقدمین نے قانون کے کئی مکاتب کی بنا ڈالی تھی۔ اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم بخوبی جانتا ہے کہ بطور ایک سیاسی اور معاشرتی قوت کے اسلام کی فتوحات کا تقریباً نصف حصہ ہمارے ائمۂ فقہ کی ذہانت اور قابلیت کا مرہونِ منت ہے .... لیکن اپنی تمام جامعیت کے باوجود فقہ کے یہ سب مکاتب بہرحال انفرادی تعبیر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اور اس طرح ان کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی وجہ سے جدید تعبیر کا دروازہ بند ہوچکا ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ علمائے اسلام کا مؤقف یہ ہے کہ فقہ کے موجودہ قواعد کو ایک طرح کی قطعیت حاصل ہے۔ لیکن اس کے باوجود علماء کے لئے کبھی یہ ممکن نہیں ہوا کہ نظری لحاظ سے اجتہاد کی آزادی سے انکار کریں۔ میں نے اُن اسباب کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے، جو میری رائے میں علماء کی اس روش کا موجب تھے۔ لیکن اب جبکہ حالات بدل چکے ہیں اور انسانی ذہن کے ہمہ جہتی ارتقاء کی وجہ سے دنیائے اسلام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہو رہی ہے، اس قدامت پسندانہ روش کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ کیا ہمارے مذاہبِ فقہ کے ائمہ نے کبھی اپنے استدلال اور تعبیر کی نسبت قطعیت کا دعویٰ کیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ میرے نزدیک زمانۂ حال کے آزاد خیال مسلمان اپنے اس دعویٰ میں بالکل حق بجانب ہیں کہ انہیں زندگی کے تجربات کی روشنی میں اور اپنے دَور کے تقاضوں کا خیال کرتے ہوئے فقہ میں جدید تعبیر کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ قرآنی تعلیم کی رُو سے زندگی ایک مسلسل ارتقائی عمل کا نام ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہر نسل کو اپنے دَور کے مسائل حل کرنے کی آزادی حاصل ہو۔ اس عمل میں اسلاف کا نمونہ ہمارے لئے رہنمائی کا ذریعہ ہونا چاہیئے نہ یہ کہ ہم اُسے اپنی ترقی کی راہ میں ایک روک بنالیں۔"

اسلامی قانون کی تدوین میں ہمارے لئے لازم ہے کہ مختلف فقہی قواعد کا مقابلہ خالصاً اُن کے حسن و قبح کی بنیاد پر کریں۔ اختلافی مسائل کا باہم موازنہ ایک آزاد اور تعصب سے پاک ذہن کے ساتھ کرنا ہوگا۔ جہاں یہ ضروری ہے کہ سب مکاتبِ فقہ کے قواعد پر بنظرِ احترام غور کیا جائے، وہاں اس بات کا فیصلہ کرتے ہوئے کہ ہمیں کون سا قاعدہ قبول کرنا چاہیئے، ہر قسم کے فرقہ وارانہ تعصبات کو بالائے طاق

رکھنا ہوگا۔ متضاد فقہی مسائل میں انتخاب کرتے ہوئے ہمارے سامنے صرف یہ اصول ہونے چاہئیں کہ کون سا قاعدہ قرآنِ کریم اور سنتِ رسولؐ کے احکام کی روح سے زیادہ موافقت رکھتا ہے۔ اور ساتھ ہی اپنے معاشرتی احوال کو مدِنظر رکھتے ہوئے کون سا حکم عوام کی بہبود کے لئے زیادہ موزوں ہوگا۔

اگر پیشِ نظر مسئلے کے حل کے لئے اِس نقطۂ نگاہ کو کام میں لایا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسی بھی فقہ کو کلیتہً اور تمام شعبہ ہائے قانون کے ضمن میں دوسرے مکاتب پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ بلکہ صورت یہ ہے کہ اگر ایک شعبہ میں سُنّی فقہ کا کوئی خاص قاعدہ بہتر معلوم ہوتا ہے تو ایک دوسرے مسئلے کی نسبت شیعہ فقہ کا قاعدہ زیادہ معقول اور ہمارے لئے زیادہ موزوں ہے۔ بلکہ عام طور پر یہ ہوگا کہ تدوین کے آخری مرحلہ پر ایک ایسا قاعدہ منتخب کیا جائے گا جو مکمل طور پر کسی ایک فقہ پر مبنی نہیں ہوگا بلکہ سُنّی اور شیعہ قواعد کے باہم امتزاج کا نتیجہ ہوگا۔

اس طرح کی مدوین کی ایک نمایاں اور قابلِ تقلید مثال ایکٹ (مسلم) تنسیخِ نکاح مجریہ سال ۱۹۳۹ء میں ملتی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، یہ قانون غیر منقسم ہندوستان کی مرکزی مجلس قانون ساز نے پاس کیا تھا۔ گو اس قانون کا ظاہری مقصد محض یہ تھا کہ تنسیخِ نکاح کے مقدمات کے متعلق اسلامی قانون کے قواعد کو یکجا اور واضح کیا جائے لیکن عملاً اس ایکٹ کے ذریعہ مستند فقہ میں نہایت اہم اور دُور رس نوعیت کی اصلاحات عمل میں لائی گئی ہیں۔ اس قانون کی بعض دفعات تو مروج اسلامی فقہ کے قواعد کے صریحاً خلاف ہیں۔ اور بعض دوسرے حصے مختلف فرقوں کے فقہی احکام کے امتزاج پر مبنی ہیں۔ اس ایکٹ سے مسلمان عورتوں کے ازدواجی حقوق میں ایک ایسی اصلاح اور بہتری عمل میں آگئی ہے جس کی کہ عرصہ سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ایکٹ کے نفاذ کے وقت علماء کے ایک خاصے با اثر حلقے کی طرف سے اس قانون کی شدید مخالفت کی گئی تھی۔ لیکن چونکہ قانون ایک مستحسن مقصد کے حصول کے لئے پاس ہوا تھا، اس لئے عوام نے اس بارے میں علماء کی قیادت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایکٹ تنسیخِ نکاح کی مخالفت کی تحریک قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔

تقسیم کے بعد اسلامی قانون کی اصلاح اور تدوین کی صرف ایک قابلِ ذکر مثال ملتی ہے یعنی مسلم عائلی قوانین کا آرڈی ننس مجریہ ۱۹۶۱ء۔ یہ آرڈی ننس اسلامی قانون کے چار مختلف شعبوں پر اثر انداز

ہوا ہے۔ اوّل۔ وراثت کے متعلق میت کی اولاد کی حد تک نمائندگی کا اصول جاری کیا گیا ہے۔ دوئم۔ تعدد ازدواج پر پابندی عائد کی گئی ہے اور ساتھ ہی نکاح کی جبری رجسٹری کا طریق نافذ کیا گیا ہے۔ سوئم۔ طلاق کے قابلِ پابندی اور قطعی ہونے سے متعلق قواعد کو قرآنی احکام کے زیادہ مطابق بنایا گیا ہے اور چہارم۔ ایکٹ امتناعِ نکاح نابالغاں (سارداایکٹ) کی بعض شقوں کو زیادہ سخت اور مؤثر کر دیا گیا ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس آرڈی ننس کے ذریعے بعض ایسی اصلاحات کی گئی ہیں، جو مروج فقہ کے احکام کے خلاف ہیں۔ تاہم اگر بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو آرڈی ننس کی تمام شقیں قرآن کریم اور سنّت کے احکام کی روح کے عین مطابق ہیں۔ وراثت کے قواعد کی تبدیلی ایک ایسی اصلاح ہے، جس کا مطالبہ عرصہ سے کیا جا رہا تھا۔ عام طور پر یہ محسوس کیا گیا تھا کہ یتیم پوتے کو اپنے دادا کی وراثت سے محروم رکھنا قرینِ انصاف نہیں ہے اور نکاح کی رجسٹریشن کا طریق محض ایک ضابطے کا معاملہ ہے جس کا اسلامی قانون کے کسی بنیادی اصول سے تضاد کا کوئی سوال نہیں ہے۔ طلاق کے ضمن میں جو تبدیلی کی گئی ہے، اس کا مقصد اصل میں یہ ہے کہ طلاقِ بدعت کو ختم کر کے اِس شعبہ قانون کو قرآنی احکام کے مطابق بنایا جائے۔ جہاں تک تعدد ازدواج پر پابندی عائد کرنے کا سوال ہے، آرڈی ننس کی اس شق سے فی الواقع ایک اہم تبدیلی عمل میں آئی ہے، لیکن یہ تبدیلی بھی کسی طرح قرآنی تعلیم کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ اس کی تائید قرآنِ کریم کی متعلقہ آیات کی ایک ایسی تفسیر سے ہوتی ہے، جو کئی عالی مرتبت علماء کے ہاں درست تسلیم کی گئی ہے۔ اور یہ تفسیر کوئی ایسی نئی بھی نہیں ہے۔ سید امیر علی نے اپنی مشہور کتاب محمڈن لا کے پہلے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۸۸۰ء) کے مقدمہ میں مسلمان علماء میں اسلامی قانون کی نسبت ترقی پسندانہ رجحانات پر بحث کرتے ہوئے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

"یہ خیال قطعاً بے بنیاد ہے کہ اس ترقی پسندانہ تحریک کا باعث مسلمانوں کے ایمان کی کمزوری ہے۔ بلکہ اس تحریک کے پیچھے اصل جذبہ یہ ہے کہ اسلام کو اپنی اصل اور خالص صورت میں دوبارہ نافذ کیا جائے اور مذہب کو ان بدعات سے پاک کیا جائے جو لبعد کے زمانہ میں پیدا ہوئیں اور جنہوں نے دین کی عظمت کو داغدار کر دیا ہے۔ اس تحریک کی نمایاں مثال تعدد ازدواج، غلامی اور قاضی سے رجوع کئے بغیر طلاق کے مسائل وغیرہ کے متعلق مسلمانوں کی اکثریت کے موجودہ خیالات ہیں۔ معاشرے کے ابتدائی دَور میں تعدد ازدواج کے حق میں خواہ کچھ بھی اسباب موجود ہوں، اس بات سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ زمانۂ حال میں یہ آزادی ایک ایسی بُرائی ہے جس کے حق میں کوئی دلیل قابلِ قبول نہیں۔ ان خیالات کی

وجہ سے نیز قرآنی احکام کی روح کے ایک بہتر ادراک کے باعث ہندوستان کے مسلمان بالعموم تعدد ازدواج کے پرانے طریق کو غیر اسلامی سمجھنے لگے ہیں۔"

لیکن اسلامی قانون کی اصلاح کے متعلق مسلم فیملی لاز آرڈی ننس قانون سازی کی واحد مثال ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یہ آرڈی ننس بھی موجودہ آئین سے پہلے نافذ کیا گیا تھا۔ اور بعد میں بنیادی حقوق کے نفاذ کے وقت یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس قانون کو آئین کے چوتھے شیڈول میں شامل کیا جائے تاکہ یہ آرڈی ننس بنیادی حقوق کی زد سے محفوظ رہے۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ آرڈی ننس کے جواز کو کس خاص بنیادی حق سے خطرہ لاحق تھا۔ ہماری رائے میں فیملی لاز آرڈی ننس کے لئے یہ آئینی تحفظ قطعاً غیر ضروری تھا۔ اور اس بارے میں اس عذر خواہانہ رویے کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ بنیادی حقوق اور زیرِ بحث آرڈی ننس جیسے اصلاحی قانون دونوں کے متعلق عوام میں ایک غلط اور بے بنیاد تاثر قائم ہو جائے۔

اسلامی قانون کی تدوین اور اصلاح کے کام اصل میں مجالسِ قانون ساز کے فرائض میں شامل ہیں۔ لیکن صورت یہ ہے کہ ہماری مجالسِ قانون ساز کے موجودہ ریکارڈ سے یہ توقع ہرگز قائم نہیں ہوتی کہ ان منتخب اداروں کی طرف سے قانونی اصلاح کا کوئی قابلِ لحاظ اقدام ہوگا۔ مجالس قانون ساز کے متعلق ہماری یہ رائے اسلامی قانون تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس میں عام قانون بھی شامل ہے۔ تقسیم ملک سے لے کر ۱۹۵۶ء کے آئین کے نفاذ تک دو دستور ساز اسمبلیاں یکے بعد دیگرے معرضِ وجود میں آئی تھیں۔ ان دونوں اداروں کے ذمے نہ صرف آئین بنانے کا کام تھا، بلکہ عبوری دور میں عام قانون سازی کا فریضہ بھی انہوں ہی کو سر انجام دینا تھا۔ اس کے بعد موجودہ آئین کے تحت دو دفعہ مجالسِ قانون ساز کا انتخاب عمل میں آ چکا ہے۔ ان چاروں مجالس میں اگر کوئی بات مشترک نظر آتی ہے تو وہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی قانون سازی میں بالعموم اور اسلامی قانون کی اصلاح میں بالخصوص چنداں دلچسپی نہیں لی۔

مجالسِ قانون ساز کے اراکین کے سامنے ایک بھاری کام ہے۔ ملک میں مسلسل بدلتے ہوئے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کی روشنی میں جدید قانون سازی کی ضرورت، ہر وقت موجود رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی موجودہ ضخیم مجموعۂ قانون کو نظرِ ثانی اور ترمیم کے ذریعے مکمل طور پر بنیادی حقوق اور قرآن اور سنّت کے احکام کے مطابق بنانا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے سیاست دان اپنے اندازِ فکر کو مکمل طور پر بدل لیں۔ قانون ساز

اداروں کی رکنیت کی خواہش اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن اس کا مقصد قانون سازی کے عمل میں شرکت ہونا چاہیئے، نہ یہ کہ اس ذریعے سے کوئی دوسرا عہدہ یا مفاد حاصل کیا جائے۔ اس بارے میں صورتِ حال ایک معقول حد تک بہتر ہو سکتی ہے، اگر سیاسی جماعتیں اپنی طرف سے صرف اُن اصحاب کو اپنا امیدوار نامزد کریں، جن کو نہ صرف قانون سازی سے واقعی دلچسپی ہو، بلکہ جن میں اس کام سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونے کے لیئے ضروری استعداد بھی موجود ہو۔

صدارتی طرزِ حکومت کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس نظام کے تحت انتظامیہ اور مقننہ میں علیحدگی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس طرح مؤخرالذکر ادارہ اپنی تمام تر توجہ جدید قانون سازی اور موجودہ قوانین کی اصلاح کے کام پر صرف کر سکتا ہے۔ اگر پاکستان میں یہ مقصد حاصل نہیں ہوا تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک موجودہ آئین کی روح کی مناسبت سے ضروری سیاسی روایات قائم نہیں کیں۔

لیکن بہترین کوششوں کے باوجود بھی یہ بات قرینِ قیاس نہیں ہے کہ کم از کم مستقبل قریب میں پاکستان کی مجالسِ قانون ساز کا کوئی معتدبہ حصہ اسلامی قانون کے ماہرین پر مشتمل ہو۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ منتخب ادارے کہاں تک اسلامی قانون کی اصلاح کے پروگرام پر عمل کرنے کے اہل ہوں گے۔ آئین میں اس مشکل کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس کا ایک حل اسلامی مشاورتی کونسل کے قیام کی صورت میں تجویز کیا گیا ہے۔ اس کونسل کے فرائض میں یہ شامل ہے کہ آئین کے پہلے ترمیمی ایکٹ مجریہ سال ۱۹۶۳ء سے قبل کے تمام نافذالعمل قوانین کا اس مقصد سے جائزہ لے کہ کیوں کر ان قوانین کو قرآنِ کریم اور سنتِ رسولؐ کے احکام کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔

یہ بات غیر یقینی ہے کہ آیا اسلامی مشاورتی کونسل جیسے ادارے سے وہ مقصد حاصل ہو سکے گا، جس کے لئے اُس کو قائم کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس خدشہ یہ ہے کہ اس کونسل کا وجود بالواسطہ طور پر اسلامی قانون کے آزاد اور ترقی پسندانہ خطوط پر ارتقار کی راہ میں ایک روک بن جائے۔ اگر مقصد یہ ہے کہ کونسل اپنے مشورہ سے مستند فقہی قواعد کی وضاحت کرے گی تو اس کے لئے اتنے بڑے آئینی اہتمام کی ضرورت نہ تھی۔ فقہ کے مسائل مستند کتب سے رجوع کرنے پر آسانی سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سمجھا گیا ہے کہ کونسل اسلامی قانون کے بنیادی مآخذ کی کسی جدید تعبیر کا کام کرے گی (جو امر اپنی جگہ نہایت بعید از قیاس

ہے) تو اس صورت میں یہ ادارہ فی الواقع ایک ایسے معاملہ میں مداخلت کرے گا جو اصل میں عوام کے منتخب اداروں کے فرائض اور اختیارات میں شامل ہے۔ بہر حال اب اسلامی مشاورتی کونسل کے ادارے کو قائم ہوئے چند سال گزر چکے ہیں اور اس کی کارگزاری کا کوئی قابلِ ذکر نمونہ سامنے نہیں آیا۔

اس مسئلے کا اصل حل یہ ہے کہ کوئی ایسا سوچا سمجھا ہوا اور جامع پروگرام مرتب کیا جائے، جس پر عمل کرنے سے ملک کے پڑھے لکھے طبقے میں اسلامی قانون کا علم فروغ پا جائے۔ ان دونوں امور کے بارے میں علامہ اقبال کے خیالات نہایت واضح تھے۔ یعنی ایک تو اُن کے نزدیک اسلامی قانون کے متعلق ماہرین کے کسی ادارے کا قیام بے فائدہ بات ہے۔ اور دوسرے اُن کی رائے میں اصل ضرورت یہ ہے کہ ملک میں اسلامی قانون کے مطالعہ کو مقبول بنایا جائے۔ ذیل میں علامہ اقبال کے خطبات میں سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جس سے ظاہر ہو گا کہ اس موضوع پر موصوف کے خیالات کیا تھے :-

"لیکن ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کے حالات میں کسی مسلمان ملک میں جو مجلسِ قانون ساز قائم ہوگی، اُس کے بیشتر اراکین اسلامی قانون کی باریکیوں سے ناواقف ہوں گے اور اس بات کا قوی احتمال ہے کہ ایسی اسمبلی اسلامی قانون کی تعبیر میں بڑی شدید غلطیوں کی مرتکب ہو۔ اس صورت میں کیا کوئی ایسا انتظام ہو سکتا ہے کہ ایسی غلطیاں بالکل نہ ہونے پائیں۔ یا اُن کے امکانات کم سے کم رہ جائیں۔ ایران کے ۱۹۰۶ء کے آئین میں یہ گنجائش رکھی گئی تھی کہ مذہبی امور کے متعلق ایسے علماء کی ایک کمیٹی قائم کی جائے، جو دنیوی معاملات سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ اس کمیٹی کے ذمہ یہ فرض تھا کہ قانون سازی کے دائرے میں مجلس (پارلیمنٹ) کے کام کی نگرانی کرے۔ میری رائے میں یہ ایک خطرناک تجویز ہے۔ لیکن شاید ایران کے مخصوص آئینی نظریے کی وجہ سے اُس ملک میں اس طرح کا انتظام ضروری تھا۔ .... لیکن بہر حال ایرانی نظریۂ آئین خواہ کچھ ہی ہو، ماہرین کی مجلس کے قیام کا یہ انتظام خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اور اگر اس کا تجربہ کرنا ضروری سمجھا جائے تو بھی ایسا صرف عارضی طور پر ہونا چاہیئے .... درست صورت یہ ہے کہ علماء بحیثیت ایک فعال عنصر کے مجالسِ قانون ساز کی رکنیت حاصل کریں۔ اور وہاں قانونی معاملات کی آزادانہ بحث و تمحیص میں حصہ لے کر ان مجالس کی رہنمائی کریں۔ اسلامی قانون کی غلط تعبیرات کا سدِباب مؤثر طور پر صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ مسلمان ممالک میں قانون کے مروج طریقۂ تعلیم میں اصلاح کی جائے۔ فقہ کے تعلیمی نصاب کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ اور

اس کے ساتھ ہی عصرِ حاضر کے عام اصولِ قانون کے مطالعہ کو بھی اس نصاب میں شامل کرنا چاہیئے۔"

مسلمانوں کے تمدن میں اُن کے قانون کو جو اہم مقام حاصل ہے، اس کی نسبت زمانۂ حال کے ایک مغربی مصنف کی رائے قارئین کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگی۔ جوزف شاخت (JOSEPH SCHACHT) نے اپنی کتاب موسوم "اسلامی قانون کا ایک تعارفی مطالعہ" (AN INTRODUCTION TO ISLAMIC LAW) کے شروع میں فقہ کی اہمیت پر حسبِ ذیل خیالات ظاہر کئے ہیں:۔

"اسلامی قانون مسلمانوں کے عام فکر کا نچوڑ ہے۔ مسلمانوں کا قانون اُن کے طرزِ زندگی کا بہترین مظہر ہے مجموعی طور پر یہ کہنا بے جا نہیں کہ اسلامی قانون دینِ اسلام کی روح اور اُس کا مغز ہے۔ فقہ کے لغوی معنی 'علم' ہے۔ خود اس سے ظاہر ہے کہ شروع کے دور میں مسلمان فقہ کو اعلیٰ ترین علم کا مترادف سمجھتے تھے ...... موجودہ دور میں بھی قدامت پسندی اور تجدد کوشی کی باہمی کش مکش میں قانون (جس میں محدود فقہی مسائل بھی شامل ہیں) ایک ممتاز بلکہ شاید اہم ترین درجہ رکھتا ہے ..... اس کے علاوہ مسلمانوں کی تمام زندگی، عربی ادب اور عربوں اور دیگر مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے تمام شعبوں پر اسلامی قانون کا گہرا اثر ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی قانون کو سمجھے بغیر خود اسلام کو سمجھنا محال ہے۔"

لہٰذا سب سے ضروری یہ بات ہے کہ ہم اپنے تعلیمی نظام میں اسلامی قانون کے مطالعے کو اس کا جائز مقام دیں، بالخصوص قانونی درس گاہوں کے نصاب میں ایک بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس وقت ان اداروں کے نصاب میں عام طور پر اسلامی قانون کو ایک ادنیٰ سا درجہ حاصل ہے۔ دیگر شعبوں سے کہیں زیادہ اس شعبے میں ایسی تبدیلی کرنا ضروری ہے جس کے ذریعہ اسلامی قانون کو مجموعی تعلیمی نصاب میں ایک نمایاں حیثیت حاصل ہو جائے۔ ملک کو ایک بھاری تعداد میں ایسے وکلاء کی ضرورت ہے جو صحیح معنوں میں فقہ کے عالم کہلا سکیں۔ یہ ضرورت نہ صرف وکالت کے پیشہ کے مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے بلکہ اس لئے بھی ہے تاکہ عدلیہ میں کام کرنے کے لئے ایسے افراد مہیا ہو سکیں، جو اسلامی قانون کے مختلف النوع شعبوں کے متعلق اپنے فرائض ادا کرنے کے اہل ہوں۔ اس کے علاوہ عام طور پر وکلاء کے طبقے سے ہی وہ سیاست دان آئیں گے، جو مجالس قانون ساز میں اسلامی قانون کی تدوین اور اصلاح کے کام میں حصہ لے سکیں ——— اسلامی قانون کے حقیقی علم کے لئے فقہ کے ابتدائی مآخذ سے استفادہ کرنے کی اہلیت کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اس لئے اربابِ اختیار کو کوئی ایسا نظامِ تعلیم رائج کرنے پر غور کرنا چاہیئے جس کے تحت ہمارے وکلاء کے لئے عربی زبان کا کم از کم اتنا علم لازمی ہو جائے جس کی مدد سے وہ قرآن، حدیث اور کتبِ فقہ کے اصل متن کو سمجھ سکیں۔ اس کے لئے دو متبادل تجاویز قابلِ غور ہیں۔ یا تو قانون کی ڈگری کے نصاب میں عربی زبان بطور ایک لازمی مضمون کے شامل کی جا سکتی ہے۔ اور یا یہ ہو سکتا ہے کہ لاء کالجوں کے داخلہ کے لئے ضروری قرار دیا جائے کہ امیدوار ایک معقول درجے تک عربی زبان جانتا ہو۔